سورۂ جنّ کی ایک آیت کی نہایت لطیف اور پُر معارف تفسیر

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۹؍نومبر ۱۹۷۱ء بمقام مسجد مبارک ربوہ)

تشہّد وتعوّذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے یہ آیۂ کریمہ تلاوت فرمائی:-

وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤى اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ۙ﴿۱۴﴾ (الجنّ: ۱۴)

اس کے بعد فرمایا:-

سورۂ جن کی اِس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ (جس گروہ کے لوگوں کا وہاں ذکر ہے انہوں نے واپس جا کر اپنے ساتھیوں سے یہ کہا کہ) ہم نے ایک کامل ہدایت اور شریعت کو سُنا اور ہم اُس پر ایمان لے آئے ہیں۔

ایمان کا لفظ عربی زبان میں مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس حصہ آیت میں ایمان کے لفظ کا تعلق صرف زبان کے اقرار سے ہے۔ مفردات راغب میں ہے کہ:-

”الایمان یستعمل تارةً اسمًا للشریعة التی جاء بِہٖ مُحَمَّدٌ عَلَیہِ الصَّلٰوۃ وَالسَّلَام...... و یوصف بہٖ کل من دخل فی شریعتہٖ مُقِرًّا باللّٰہ وبنبوَّتِہٖ“

ایمان کا لفظ کبھی عربی زبان میں اقرار باللسان کے معنوں میں بھی آتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اسلامی محاورہ میں، کیونکہ عربی زبان پر قرآن کریم کی زبان کا بڑا اثر ہوا ہے گو وہ

پہلے بھی بڑی اچھی اور بہترین زبان تھی لیکن قرآن کریم کی وحی کی عربی نے عربی زبان پر بڑا اثر کیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ جب ہم مصر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ گاڑی میں سفر کرتے ہوئے ایک نوجوان ہم سفر ہر بات میں قرآن کریم کی آیات کا کوئی نہ کوئی ٹکڑا استعمال کرتا تھا چنانچہ میری طبیعت پر یہ اثر تھا کہ یہ نوجوان قرآن کریم سے بڑی محبت رکھتا ہے اِس لئے اسے قرآن کریم ازبر ہے۔ خیر ہم باتیں کرتے رہے۔ کوئی گھنٹے دو گھنٹے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ عیسائی ہے۔ مَیں نے اُسے کہا کہ تم عیسائی ہو مگر قرآنِ کریم کی آیات کے فقرے کے فقرے استعمال کرتے ہو۔ وہ کہنے لگا۔ مَیں عیسائی تو ہوں لیکن قرآنِ کریم کی عربی سے ہم بچ نہیں سکتے۔ یہ ہمارے ذہنوں اور زبان پر بڑا اثر کرتی ہے۔

پس قرآن کریم کی عربی یا قرآنِ کریم کی اصطلاح میں امام راغب کے نزدیک ایمان کے کبھی یہ معنے ہوتے ہیں کہ زبان سے اس بات کا اقرار کیا جائے یعنی آدمی یہ کہے کہ میں شریعتِ محمدیہ کو قبول کرتا ہوں اور اُس اللہ پر ایمان لاتا ہوں جسے قرآن کریم اور اسلام نے پیش کیا ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا زبان سے اقرار کرتا ہوں۔ ایسا آدمی مومن ہو جاتا ہے۔ اس آیت کے پہلے فقرے میں ایمان کا لفظ اسی معنے میں استعمال ہوا ہے کہ ہم نے اس شریعت اور ہدایت کو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو رہی ہے اس کو سُنا اور اُس پر ایمان لے آئے۔

اس آیت کے دوسرے ٹکڑے میں ایمان کا لفظ ایک اَور معنے میں استعمال ہوا ہے اور وہ اس معنے میں ہے جس میں اللہ تعالیٰ کبھی اپنے بندے کی مدح کرتا ہے یعنی اس کی صفت بیان کرتا ہے اور کبھی اس کو اس بات پر جوش دلاتا ہے کہ تمہیں ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہئے اور اس معنے میں ایمان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زبان سے اقرار کرنا اور دل سے (اپنے اقرار کے مطابق) شریعتِ محمدیہؐ یعنی اللہ تعالیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حقیقتاً وہی سمجھنا جو قرآن کریم نے بیان کیا ہے اور جس کا زبان سے اقرار کیا گیا ہے اور یہ دل سے سمجھنا یعنی یہ نہ ہو کہ زبان پر کچھ ہو اور دل میں کچھ اَور ہو اور پھر بے عمل نہیں رہنا کیونکہ انسان کے سارے اعضاء پر اسلامی شریعت حاوی ہے۔ شریعت کے کسی حکم کا تعلق اس کی آنکھ سے ہے اور کسی کا تعلق اس کی زبان

سے ہے جبکہ وہ بول رہی ہوتی ہے اور کسی حکم کا تعلق اس کی زبان سے ہے جبکہ وہ چکھ رہی ہوتی ہے مثلاً فرمایا سُؤر نہیں کھانا یا فرمایا کہ خون نہیں کھانا۔ اب یہ اُس زبان سے تعلق نہیں رکھتا جو بول رہی ہوتی ہے بلکہ اس کا اُس زبان سے تعلق ہے جو چکھ رہی ہوتی ہے۔ کسی حکم کا تعلق انسان کے کان سے ہے اور کسی حکم کا تعلق اس کے دماغ سے ہے یعنی کسی کے متعلق برائی سوچنی بھی نہیں۔ یہ امراس کے دماغ سے تعلق رکھتا ہے۔ دماغ بھی جسم کا ایک حصہ ہے۔ اسی طرح انسانی جسم کے مختلف حصوں مثلاً اس کی ٹانگوں پر، اس کے ہاتھوں پر یا اس کی انگلیوں پر شرعی احکام کا اطلاق ہوتا ہے۔ انگلیوں کے متعلق مثلاً یہ حکم ہے کہ کوئی چیز تولتے وقت انگلی کو تھوڑا سا خم دے کر کچھ واپس نہیں لے لینا اور یہ حکم دکانداروں کے لئے ہے۔ کئی دکاندار ایسا گناہ بھی کر جاتے ہیں پھر انگلی کے ساتھ تعلق رکھنے والا ایک حکم یہ بھی ہے کہ کسی کے دل دُکھانے والی بات اپنی قلم سے نہیں لکھنی۔

پس شریعت محمدیہ کے سارے احکام کامل اور مکمل طور پر انسان کے تمام اجزاء اور اس کے اعمال پر حاوی ہیں۔ انسان کو یہ بتا دیا گیا ہے کہ یہ کرنا ہے اور یہ نہیں کرنا۔

غرض انسان کے جو اعمال ہیں، جن کے بجالانے کی اللہ تعالیٰ نے اُسے طاقت دی ہے وہ بھی گواہی دیں کہ دل نے واقعی تصدیق کی ہے اور زبان نے جو اقرار کیا ہے وہ منافقانہ اقرار نہیں ہے۔ وہ احمقانہ اقرار نہیں ہے۔ وہ مصلحت بینی کے نتیجہ میں اقرار نہیں ہے بلکہ انسان نے ایک حقیقت کو دیکھا، پرکھا، سچا پایا اور اس کا اقرار کیا اور دل نے اس کی تصدیق کی اور پھر انسان سر سے لے کر پاؤں تک اُس پر قربان ہو گیا۔ یہ ایمان ہے۔ اس آیت کے دوسرے حصے میں اسی معنے میں ایمان کا لفظ استعمال ہوا ہے مثلاً یہ ایمان ہے کہ روزے رکھو۔ روزوں کا مہینہ اب ختم ہو رہا ہے لوگوں نے روزے رکھے، سوائے بیمار اور معذوروں کے جو لوگ بیماری اور معذوری کی وجہ سے روزہ نہیں رکھتے، محسوس تو وہ بھی کرتے ہیں دُکھ وہ بھی اُٹھاتے ہیں۔ جو لوگ روزہ رکھتے ہیں وہ بھوک کا دُکھ اُٹھاتے ہیں اور جو روزہ نہیں رکھتے بوجہ معذوری، وہ روزہ نہ رکھنے کا جو طبیعت میں ایک دُکھ پیدا ہوتا ہے، وہ اُسے برداشت کر رہے ہوتے ہیں۔ غرض دونوں تکلیف میں سے گذر رہے ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ جس نے روزہ نہیں رکھا (درآنحالیکہ وہ

مومن ہے اور اس کی نیت بھی ہے) اُس نے روزے کا جسمانی اور ظاہری دُکھ نہیں اُٹھایا۔ ایک ظاہری تکلیف تو ہے جو روزے دار خدا کی خاطر اُٹھاتے ہیں لیکن جو بیماری اور معذوری کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتا شاید اُس نے زیادہ دُکھ اُٹھایا اور اگر زیادہ اُٹھایا تو شاید وہ ثواب کا بھی زیادہ مستحق ہو گیا۔ و اللّٰہ اعلم۔ اللہ تعالیٰ ثواب دیتا ہے ہم تو اس کے اُوپر کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔

پس فرمایا کہ جو شخص دوسرے حصہ آیت میں بیان کردہ ایمان کے مطابق اپنے رب پر ایمان لایا اور رب پر ایمان لانے کے مفہوم کے اندر حقیقتاً شریعت محمدیہ پر ایمان اور اللہ تعالیٰ کی تمام صفات پر ایمان اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان آجاتا ہے کیونکہ ربّ کے معنے ہیں پیدا کر کے درجہ بدرجہ اور تدریجاً ترقی دینے والا یعنی وہ ہستی جو نشو و نما دے کر انسان کو ترقی کے مدارج طے کرواتی ہے۔

جیسا کہ بڑی وضاحت اور تشریح کے ساتھ دوسری جگہ بیان ہوا ہے کہ انسان کو روحانی طور پر ترقیات کی منازل میں سے گذار کر آدمؑ، پھر نوحؑ، پھر موسیٰؑ اور پھر سینکڑوں اور جو شارع نبی ہوئے ہیں، علیہم السّلام۔ اُن کے زمانے میں انسان کی روحانیت درجہ بدرجہ ترقی کر رہی تھی۔

بالآخر اللہ تعالیٰ انسان کو اس ترقی کے مقام پر لے آیا کہ وہ کامل اور مکمل شریعت کا حامل بن سکتا تھا۔ ربوبیت کے معنی میں یہ بات آتی ہے کہ اگر انسان ترقی کرے (اور عقل اور تاریخ کہتی ہے کہ انسانیت نے ترقی کی) اور کسی ایک منزل پر جا کر آگے راہنمائی کے لئے اگر کوئی نُور آسمان سے نازل نہ ہو، کوئی نئی شریعت نہ آئے کہ اس کے نئے تقاضوں کو اور بڑھی ہوئی طاقتوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے والی ہو تو گویا اس کو رب پر ایمان نہیں ہے۔ وہ تو سمجھے گا کہ رب ہے ہی نہیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔

غرض رب پر ایمان دراصل وہی ہے جس کا **اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ** میں ذکر کیا گیا ہے کہ ساری تعریف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتی ہے اور اسی سے ہر تعریف کا منبع پھوٹتا ہے۔ انسان کی جب درست تعریف ہو تو اُسے سمجھنا چاہئے کہ اسے حمد کا جو مقام ملا ہے، وہ اللہ تعالیٰ

کی طرف سے ملا ہے اگر خدا تعالیٰ کی نگاہ میں کوئی شخص مغضوب اور ملعون اور دھتکارا ہوا ہو تو دُنیا کی طاقتیں اُسے حقیقی عزت نہیں پہنچا سکتیں یہ تو ایک دھوکا ہے، سراب ہے۔ کئی لوگ بہک جاتے ہیں کئی بچ جاتے ہیں لیکن بہرحال حقیقی عزت اور تعریف کا استحقاق خدا تعالیٰ کی محبت اور پیار اور رحمت کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے ورنہ حمد کا اور تعریف کا استحقاق پیدا ہی نہیں ہوتا۔ سب دھوکا اور سراب ہے۔ اس لئے فرمایا کہ جو شخص بھی اپنے رب پر ایمان لاتا ہے۔ ”فَلَا یَخَافُ بَخۡسًا وَّ لَا رَهَقًا“ (الجّن : ۱۴) اس کو نہ بخس کا کوئی خوف رہتا ہے اور نہ رھق کا کوئی خوف رہتا ہے۔

بخس کے معنے ہیں ظلم کر کے کسی کو نقصان پہنچانا مگر جو شخص مومن ہوتا ہے اس کو یہ خوف نہیں ہوتا کہ اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور جس طرح دوسرے مذاہب کا عقیدہ ہے کہ ایک دفعہ جنّت میں لے جائے جانے کے بعد پھر جنّت سے نکال دیا جائے گا۔ شریعت محمدیہ پر ایمان لانے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے نتیجہ میں وہ جنّت نہیں ملتی جس سے انسان نکالا جاتا اور دھتکار دیا جاتا ہے اور اُسے یہ کہا جاتا ہے کہ پھر از سر نو کوشش کرو اگر تم مستحق ٹھہرے تو تمہیں جنت مل جائے گی۔

پس اگر عارضی جنت کا عقیدہ درست ہو تو پھر یہ بَخۡسًا ہے۔ انسانی فطرت یہ کہتی ہے کہ اُس پر ظلم ہو گیا کیونکہ انسان کی طاقتیں محدود تھیں اور اُسے محدود زمانہ دیا گیا اگر تو غیر محدود زمانہ دیا جاتا تو پھر غیر محدود عمل ممکن ہوتے اور غیر محدود جنت ہو جاتی اور آپس میں CLASH (کلیش) ہو جاتا کیونکہ دو غیر محدود تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے سے سر ٹکرا دینے تھے۔ جو عقلاً درست نہیں ہے مضمون دقیق ہے مگر جو سمجھنے والے ہیں وہ سمجھ جائیں گے دو غیر محدود ایک دوسرے کا نتیجہ نہیں ہو سکتے کیونکہ نتیجہ انتہاء ہوتا ہے۔ غیر محدود ابتلاء اور امتحان کا زمانہ اور غیر محدود جزاء اور جنت۔ یہ بات عقل میں نہیں آتی۔

پس اگر غیر محدود جنتیں ہیں جن کی انتہاء کوئی نہیں تو عمل محدود ہی ہونے تھے اور جنت غیر محدود ہوگی، رحمتِ الٰہی غیر محدود ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

”رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ“ (الاعراف: ۱۵۷)

خدا تعالیٰ کی رحمت کے مقابلے میں زمانہ کیا چیز ہے۔ یہ تو اس کی ایک پیداوار ہے لیکن اس کی رحمت کی موجیں تو اس کی ہر پیداوار کے اُوپر سے گذر رہی ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت نے ہر چیز اور ہر مخلوق کا احاطہ کیا ہوا ہے۔

لیکن ہماری فطرت اور ہماری شریعت ہر دو ہمیں یہی کہتی ہیں کہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہر چیز کے اوپر حاوی ہے۔ اس واسطے کہ اگر ہماری فطرت یہ نہ کہتی تو محدود عمل کی غیر محدود جزاء کی توقع اور اُمید ہم کیسے رکھتے۔ خدا تعالیٰ نے ہماری فطرت کے اندر یہ ڈالا ہے کہ یہ تو ٹھیک ہے تمہیں تھوڑی عمر دی گئی ہے، تمہیں تھوڑے وسائل دیئے گئے ہیں لیکن تمہیں ایک بشارت دے دیتے ہیں کہ اگر تم اپنی اس تھوڑی زندگی میں، اس چھوٹی زندگی میں، خلوصِ نیت کے ساتھ اور کامل توحید پر قائم ہو کر اور شرک کے ہر پہلو سے بچتے ہوئے محدود عمل کرو گے تو تمہیں غیر محدود جزاء مل جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں بھی یہی رکھا ہے اور شریعت سے بھی یہی کہلوایا ہے۔

پس یہ اسلامی شریعت ایسی شریعت ہے کہ جو آدمی اس پر ایمان لاتا ہے اُسے یہ خطرہ لاحق نہیں ہوتا کہ اس پر ظلم ہو گا اور وہ گھاٹے اور نقصان میں رہے گا۔

قرآن کریم نے مختلف پہلوؤں سے اس مضمون پر روشنی ڈالی ہے اور بڑے پیارے رنگ میں روشنی ڈالی ہے۔ قرآن کریم نے ظلم کے متعلق تو یہ اعلان کر دیا:-

”وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ۔“ (قٓ:۳۰)

اور اس قسم کی اور بھی بہت سی آیات ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا۔ تو اس سے انسان کی تسلی ہو گئی۔

پھر فرمایا:-

”فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كَاتِبُوْنَ“

(الانبیاء:۹۵)

کہ جو ایمان لائے گا اور ایمان کے تقاضوں کو پورا کرے گا اور عمل صالح بجا لائے گا نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ تو ”فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ“

اس کی کوشش اور اس کے عمل بوجہ انسان ہونے کے اگر ناقص رہ جائیں گے تب بھی ردّ نہیں کئے جائیں گے۔ فَلَا کُفْرَانَ لِسَعْیِهٖ میں یہ نہیں فرمایا کہ تمہاری سعی قابلِ قبول ہوگی ردّ نہیں کی جائے گی بلکہ فرمایا کہ جو شخص اعمال صالحہ بجالائے گا اور وہ مومن ہوگا اور ایمان کے جُملہ تقاضوں کو پورا کرے گا تو ”فَلَا کُفْرَانَ لِسَعْیِهٖ“ اس کو ہم یہ تسلی دیتے ہیں کہ بشری کمزوری کے نتیجہ میں اگر اس کے اعمال میں کوئی کمی اور نقص رہ جائے گا تب بھی اس کے اعمال ردّ نہیں کئے جائیں گے۔ وہ قبول کر لئے جائیں گے۔ اب یہ کتنا بڑا وعدہ ہے جو فَلَا یَخَافُ بَخْسًا میں انسان کو دیا گیا ہے۔

پھر فرمایا:-

”وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَلَهٗ جَزَآءَ نِ الْحُسْنٰی“ (الکہف: ۸۹)

یعنی جو ایمان لایا اور مناسب حال اعمال بجالایا اُسے بہترین جزا دی جائے گی۔ کسی جگہ فرمایا عَشْرُ اَمْثَالِهَا دس گناہ زیادہ دی جائے گی۔ اس طرح پھر ظلم کا تو کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔ رحمت ہی رحمت ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہی ہے۔ انسان کا تھوڑا سا عمل ہوتا ہے اور اُسے بہت بڑی جزا مل جاتی ہے۔

آپ اجتماعی طور پر دیکھیں کہ جماعت احمدیہ خدا تعالیٰ کی راہ کے مالی میدان میں مجموعی لحاظ سے کیا خرچ کر رہی ہے۔ وہیں سے مالی لحاظ سے ہمارا عمل شروع ہوتا ہے۔ اس کے لئے ذرائع اور وسائل اکٹھے کئے جاتے ہیں لیکن اس کے مقابلے میں اتنے زبردست نتائج نکل رہے ہیں کہ مَیں تو جب سوچتا ہوں تو میری عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ جماعت احمدیہ اور غلبۂ اسلام کے حق میں اس وقت جو ایک انقلاب بپا ہو رہا ہے، اُسے مَیں کس طرح اپنی کوششوں کی طرف منسوب کر دوں۔ ہر دو میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ ہماری کوشش بہت تھوڑی سی ہوتی ہے لیکن نتائج بڑے زبردست نکل رہے ہیں اسی لئے میں آپ کو بار بار توجہ دلا رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ادا کیا کریں کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے وہی اس کی مزید رحمتوں کا مستحق بنتا ہے۔

پس لَا یَخَافُ بَخْسًا کی رو سے بہترین جزا ملے گی۔ عمل ردّ نہیں کئے جائیں گے ذرا ظلم

نہیں کیا جائے گا۔ اسلامی شریعت پر ایمان لانے کے نتیجہ میں جو آدمی ایمان کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے، نہ اس کو نقصان کا کوئی خطرہ ہوتا ہے اور نہ ظلم کا کوئی خطرہ ہوتا ہے بلکہ ایک نیک عمل کے بدلے میں دس، ایک کے بدلے میں شاید دو سو، ایک کے بدلے میں شاید دو ہزار، ایک کے بدلے میں شاید دو کروڑ یا دو ارب گنا زیادہ بلکہ شاید اَن گنت جزا ملے گی کیونکہ اگر جزا اَن گِنت نہ ہوگی تو جنتیں ہمیشہ کے لئے کیسے بن جائیں گی۔ تو فرمایا لَا يَخَافُ بَخْسًا جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت پر ایمان لایا اور قرآن کریم نے جس رنگ میں اللہ تعالیٰ کو پیش کیا ہے اس رنگ میں اس کی ہستی پر اور اس کی صفات پر ایمان لایا اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کو پہچانا اور جس نے محبت اور عشق میں ایک نئی زندگی حاصل کر کے خلوص نیت کے ساتھ خدا کی راہ میں کچھ کیا اور اگر بشری کمزوریوں کے نتیجہ میں وہ عمل ناقص تھا تب بھی ناقص جزا نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں بھی اتنی بڑی جزا ہے کہ وہ ہمارے ذہن میں سما نہیں سکتی۔

پھر فرمایا وَلَا رَهَقًا اس کو رَهَق کا بھی خوف نہیں ہوگا۔ (مَیں نے آج منجد دیکھی تھی۔ اس میں) رَهَق کے چار معنے بتائے گئے ہیں اور وہ چاروں معنے تفسیری لحاظ سے یہاں لگتے ہیں۔

رَهَق کے ایک معنے اَلْاِثْمُ یعنی گناہ کے ہیں۔ اگر شریعت کامل نہ ہو۔ وہ بعض حصوں کو لے اور بعض حصوں کو نہ لے جس کا مطلب یہ ہے کہ بعض حصوں کے متعلق ہدایت دے اور بعض حصوں کو انسان پر چھوڑ دے تب بھی گناہ کا خطرہ رہتا ہے کہ جو اس نے فیصلہ کیا ہے وہ درست نہیں ہے۔

مگر یہاں فرمایا کہ شریعت محمدیہ پر ایمان لانے والے کو (اگر وہ اس پر کاربند ہوتا ہے) اثم کا کوئی خطرہ نہیں رہتا اس لئے کہ یہ شریعت کامل اور مکمل ہے۔ اس لئے کہ یہ شریعت خیر محض ہے۔ قرآن کریم کے ایک لفظ ”خَيْرًا“ میں شریعت محمدیہ کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے:-

”مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ط قَالُوْا خَيْرًا“ (النحل: ۳۱)

شریعت محمدیہ بھلائی ہی بھلائی ہے اس واسطے اثم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر انسان کی فطرت بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے اور انسانی فطرت کو نیک اور بد میں تمیز کرنے کی توفیق بھی اُسی نے عطا فرمائی ہے۔ انسانی فطرت (اور اس سے میری مراد وہ فطرت ہے جو مسخ نہ ہو چکی ہو) کسی چیز کو بدقرار نہیں دے گی جسے شریعت محمدیہ نے بدقرار نہ دیا ہو اور انسانی فطرت کسی چیز کو نیکی اور بھلائی اور ثواب کا موجب قرار نہیں دے گی کہ جس کا حکم شریعت محمدیہ میں نہ ہو کیونکہ خود قرآن کریم فرماتا ہے:-

”فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا“ (الرّوم:۳۱)

خدا تعالیٰ نے انسانی فطرت کو پیدا کیا ہے یہ اس کا عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو ایک کامل شریعت کے رنگ میں اپنی وحی کے ذریعہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے اور یہ اس کا قول ہے اور اللہ تعالیٰ کے فعل اور اس کے قول میں تضاد نہیں ہوا کرتا۔

پس فطرت جن چیزوں کو نیکی کی باتیں قرار دیتی ہے، انہیں باتوں کا قرآن کریم حکم دیتا ہے۔ اس واسطے ”اثم“ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ کہیں فطرت کا وحی کے ساتھ تصادم نہ ہو جائے۔ اس قسم کا کوئی خوف نہیں ہوتا کیونکہ جس خدا نے فطرت کو پیدا کیا ہے اُسی نے وحی کو نازل فرمایا ہے اسی واسطے مومنوں کی یہ تعریف بیان کی گئی ہے کہ:-

”یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ“ (آل عمران:۱۰۵)

رَهَق کے دوسرے معنے خِفَّةُ الْعَقْلِ کے ہیں جس کا مطلب یہ ہے ان کو کم عقلی کا کوئی خوف نہیں ہوگا۔

یعنی قرآن کریم نے یہ اعلان کیا ہے کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ گے تو علاوہ اَور بہت سے روحانی فوائد کے، تمہیں ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ تمہاری عقلوں کو جلا ملے گی نیّرِ الہام کے بغیر عقل کو جلا نہیں مل سکتی اور پھر الہام اور وحی بھی وہ جو کامل شکل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے کامل وجود پر نازل ہوئی اور جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔

غرض فَلَا یَخَافُ رَهَقًا میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

کہ انسان کو کم عقلی کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ قرآن کریم پر غور کرے گا، فکر کرے گا

اور تدبر کرے گا (جس کی طرف قرآن کریم میں بار بار توجہ دلائی گئی ہے) تو اس کی عقل اس نہج پر نشوونما پائے گی کہ دنیوی میدان میں بھی، دُنیا کے مسائل میں بھی اگر انسان فکر اور تدبر کرے گا تو صحیح نتیجہ پر پہنچ جائے گا۔ ویسے یہ عقل جو ہے اس کا تو یہ حال ہے کہ بڑے بڑے عقلمند کہلانے والے سوچتے اور غور تو کرتے ہیں مگر بسا اوقات غلط نتائج پر پہنچ جاتے ہیں بڑے بڑے چوٹی کے ماہرین آج ایک بات کہتے ہیں اور دس سال کے بعد ان سے بھی بڑا عقل کا ایک اَور دعویدار کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ بالکل بیوقوفی کی بات کر گئے ہیں اور یہ بات ہر سائنس میں ہمارے مشاہدہ میں آتی ہے لیکن قرآن کریم کے اصول پر جس عقل کو جس دماغ کو سوچنے اور قرآن کریم کی بتائی ہوئی نہج پر غور کرنے کی عادت پڑ جائے اس کے لئے دُنیا میں بھی ٹھوکر کھانے کا خطرہ کم ہو جاتا ہے ویسے انسان انسان ہے وہ ٹھوکر تو کھائے گا لیکن دوسروں کی نسبت خطرہ کم ہو جائے گا۔

بہرحال قرآن کریم کی شریعت عقل کو جلا دینے والی ہے۔ اگر کسی نے ٹھوکر کھائی ہے تو اس کا ذمہ وار وہ خود ہے قرآن کریم ذمہ وار نہیں ہے۔ اُس نے خود کہیں نہ کہیں قرآن کریم کے طریق کو چھوڑا اور اس کے نتیجہ میں ٹھوکر کھائی ہے۔

رہق کے تیسرے معنے جہالت اور کم علمی کے ہیں۔ لَا يَخَافُ رَهَقًا میں قرآن کریم کے متعلق یہ اعلان ہو گیا کہ یہ علم کا نہ ختم ہونے والا سمندر ہے اور جب یہ انسان کے ہاتھ میں آ جاتا ہے تو پھر اس کو جہالت اور کم علمی کا خوف کیسے ہوگا۔ ہر زمانہ اور ہر ملک کو اس طرف توجہ دلائی کہ زمان و مکاں کے بدلے ہوئے اور مختلف حالات میں یہ قرآن عظیم تمہاری کامل رہبری کے لئے کافی ہے آب و ہوا کے لحاظ سے غذائیں مختلف ہو گئیں۔ پھر مختلف غذاؤں کے نتیجہ میں انسان پر ان کے اثرات مختلف ہو گئے اور اس کے نتیجہ میں بعض جگہ بعض اخلاق کی نگرانی کی زیادہ ضرورت پڑ گئی اور بعض اخلاق کی طرف (بعض دوسرے اخلاق کی نسبت) زیادہ توجہ دے کر ان کی نشوونما کی ضرورت پڑ گئی اور اس طرح ملک ملک میں فرق آ جائے گا پھر زمانہ ہے، وہ تو واضح ہے کہ جو آج کے مسائل ہیں وہ سو سال پہلے کے مسائل نہیں اور جو آج کے مسائل ہیں وہ ہزار سال بعد کے مسائل نہیں ہوں گے۔

پس وَلَا رَهَقًا میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ خواہ تم کسی بھی ملک سے تعلق رکھتے ہو یا کسی بھی زمانہ میں پیدا ہوئے ہو قرآن کریم کی شریعت پر عمل کر کے کم علمی کے نتیجہ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ قرآن کریم تو تمہارے سامنے علم کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے۔ تم مطہر بنو قرآن کریم کے علمی خزانوں کی چابیاں تمہارے ہاتھ میں دے دی جائیں گی پھر تم اس سے فائدہ اُٹھانا۔ تمہیں جہالت کا کوئی خوف نہیں ہوگا۔

ویسے انسان تو بڑا عاجز ہے اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے۔ میں نے اپنے اس مختصر سے زمانۂ خلافت میں دو دفعہ باہر کے دورے کئے ہیں۔ ان دونوں موقعوں پر عیسائی پادری اور دوسرے صحافی ملاقاتوں اور پریس کانفرنسوں میں سوال کرتے تھے جن میں بعض سوال ایسے بھی ہوتے تھے کہ نہ آپ نے پہلے کبھی سُنے اور نہ میں نے سُنے ہوتے اور میرے ساتھی بھی گھبرا جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے خود ہی ایسا جواب سِکھا دیتا تھا کہ جسے سُن کر وہ خاموش ہو جاتے تھے۔ بعض دفعہ بول بھی نہیں سکتے تھے مثلاً پہلی دفعہ ۱۹۶۷ء میں جب میں نے یورپ کا دورہ کیا اُس وقت عرب اسرائیل جنگ ابھی تازہ تازہ ہو کر ختم ہوئی تھی اور یورپ میں مسلمانوں کے خلاف بڑا تعصب پایا جاتا تھا۔ یہودیوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بڑا پروپیگنڈہ کیا تھا چنانچہ ہالینڈ میں ایک پریس کانفرنس کے دوران ایک کیتھولک نوجوان صحافی سوال کرنے لگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ وہ میرے ساتھ بات بڑے احترام سے کرتے تھے ویسے تو وہ آزاد ہیں وہ اپنے بڑے بڑے لوگوں کو کچھ نہیں سمجھتے۔ میں تو الحمد للہ پڑھتا تھا کیونکہ ایک عاجز انسان ہوں بہرحال وہ بڑے ادب سے بات کرتے تھے۔ اس صحافی نے بھی بات تو بڑے ادب سے کی لیکن اس کی آنکھوں میں شوخی تھی۔ اُس نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ ہمارے ملک یعنی ہالینڈ میں آپ اس وقت تک کتنے لوگوں کو مسلمان بنا چکے ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں یہ جواب دوں گا کہ چند درجن۔ تو اس سے ان سارے صحافیوں پر جو یہاں بیٹھے ہیں یہ اثر پڑے گا کہ یہ تو کوئی کامیابی نہیں ہے اتنے بڑے ملک میں جہاں ملینز (millions) کی آبادی ہے اس میں چند درجن لوگ احمدی مسلمان بن گئے ہیں تو کیا ہے۔ اب یہ پہلی دفعہ سوال سُنا۔ اللہ تعالیٰ ہی ایسے سوالوں کا جواب دل میں ڈالتا ہے چنانچہ اسی وقت خدا تعالیٰ نے مجھے اس

سوال کا جواب سکھایا۔ میں نے اس سے کہا کہ جتنا عرصہ حضرت مسیح علیہ السلام اس دُنیا میں رہے اور اس عرصہ کی تعیین میں میرا اور تمہارا اختلاف ہوسکتا ہے لیکن جتنا عرصہ بھی وہ اس دُنیا میں رہے ساری عمر میں انہوں نے جتنے عیسائی بنائے تھے اس سے زیادہ ہم تمہارے ملک میں مسلمان بنا چکے ہیں۔ اس پر وہ ایسا خاموش ہوا کہ پھر اس نے مجھ سے سوال کرنا ہی چھوڑ دیا حالانکہ میں نے کہا بھی کہ اَور سوال کرو میری دلچسپی قائم ہے۔ اب یہ کہ اچانک سوال ہو اور پھر یہ جواب آ جائے یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ بعض دفعہ پتہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ کیا جواب دے رہا ہوں، دماغ جواب دے رہا ہوتا تھا اور انسان اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ پڑھ رہا ہوتا تھا۔

پس دراصل حقیقی علم کا منبع اور سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس منبع سے یہ کتاب (یعنی قرآن کریم) اس دعوے کے ساتھ نازل کی گئی ہے کہ یہ قیامت تک کے مسائل کو حل کرے گی۔ اس نے قیامت تک کے مسائل کو حل کر دیا ہے۔ ہمیں اس پر بھی ایمان لانا چاہیئے۔ اب لوگ اس حقیقت کے بھی قائل ہو رہے ہیں البتہ جو بھٹکتے ہیں وہ کہاں مانتے ہیں دراصل آج کل کے عقلمند نے اس دُنیا کو مصیبت میں ڈالا ہوا ہے جتنا آج کا عقلمند خود کو دُنیا کی نگاہ میں ملعون بنا چکا ہے کسی زمانہ میں بھی ’’عقلمند‘‘ پر خود انسان نے اتنی لعنت کبھی نہیں بھیجی۔ یہ عجیب عقلمندی ہے اور تہذیب میں ترقی ہے کہ جس کی وجہ سے انسانیت کی جان خطرے میں پڑ گئی ہے۔ اس سے پہلے تو پانچ انسانوں کی جان خطرے میں ہوتی تھی یا پانچ ہزار انسانوں کی جان خطرے میں ہوتی تھی یا پانچ لاکھ انسانوں کی جان خطرے میں ہوتی تھی یا پانچ ملین انسانوں کی جان خطرے میں ہوتی تھی مگر اب تہذیب میں کیا آگے بڑھے کہ تمام بنی نوع انسان کی جان خطرے میں ہے اتنی عقل تیز ہوئی اس عقل پر لعنت ہے جس کی تیزی نے اس دُنیا میں انسانیت کو مٹانے کی سکیمیں بنا لی ہیں لیکن جہالت، سفاہت اور حُمق کے مقابلے کے لئے جو علم اور فراست اور ظلمات کو دور کرنے کے لئے نور قرآن کریم سے حاصل کیا جا سکتا ہے، وہ حقیقی بھی ہے اور نہ ختم ہونے والا بھی ہے۔ کسی وقت بھی یہ خطرہ نہیں کہ عقل آگے بڑھ گئی اور اب انسان کو وحی و الہام کی ضرورت نہیں رہی۔ کئی فلسفی لوگ ہیں جن میں سے بعض نے مسلمانوں کو بھی بڑا متاثر کیا ہے لیکن ہم ایسی ہزارہا مثالیں دے سکتے ہیں کہ جہاں عقل نے

مذہب کے رشتے توڑ کر اندھیری کھائی میں چھلانگ لگائی ہے اور وہ انسان کو روشنیوں کی طرف لے کر نہیں گئی۔

پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا:- وَلَا رَهَقًا اپنے رب پر ایمان لانے والا اور ایمانی تقاضوں کو پورا کر کے اپنی زندگی کو اسوۂ محمدی میں ڈھالنے والا اور شریعت محمدیہ پر عمل کرنے والا انسان وَلَا رَهَقًا کا مصداق ہے۔ اُسے کسی جہالت یا سفاہت یا حماقت کا کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ روشنی کا ایک مینار اس کے پاس لا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ نور کے ایک سرچشمے سے اس کا تعلق قائم کر دیا گیا ہے۔ جس شخص کا تعلق حقیقی طور پر اور سچے معنوں میں نور کے سرچشمے سے قائم کر دیا جاتا ہے، اس کو اندھیرے سے کیا خوف ہوسکتا ہے۔

رَهَقًا کے چوتھے معنے یہ ہیں کہ اسلامی شریعت اتنی حسین ہے کہ تم کسی حالت میں بھی کیوں نہ ہو، وہ تمہارے لئے تکلیف مالایطاق پیدا نہیں کرتی کیونکہ رَهَق کے چوتھے معنے منجد میں یہ لکھے ہیں:-

”حَمْلُ الْمَرْءِ عَلٰى مَالَا يُطِيْقُهٗ“

یعنی کسی شخص پر ایسا بوجھ ڈالنا کہ جسے وہ برداشت نہ کر سکے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے، بار بار دُہرانے کی ضرورت نہیں آپ سمجھتے ہیں کہ اس میں ہر انسان مخاطب ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے انسان کو بھی مخاطب کیا ہے۔ ہمیں بھی مخاطب کیا ہے اور ہم سے ایک ہزار سال بعد اگر دُنیا رہی تو اس وقت کے انسان کو بھی قرآن کریم مخاطب کر کے یہی کہے گا۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرة:۲۸۷)

کہ تمہاری وسعت کے مطابق تم پر بار ڈالا جائے گا اس میں کِسی فلسفے کی ضرورت نہیں ہے۔ شریعت میں اتنی لچک ضرور ہونی چاہئے کہ ہر فرد کی طاقت کے مطابق اس کی ہدایتیں بدلتی چلی جائیں۔ قرآن کریم کے بہت سے احکام میں سے مثلاً روزہ کو لے لو۔ ایک صحت مند بچہ ہے اور نظر آ رہا ہے کہ وہ پہلوان بننے والا ہے لیکن دس سال کی عمر میں خدا تعالیٰ نے اُسے فرمایا کہ روزہ نہیں رکھنا کیونکہ ابھی تم میں روزے کی طاقت پیدا نہیں ہوئی۔ اب امریکہ میں جو نئے

تجربے کئے گئے ہیں وَاللّٰہُ اَعْلَمُ کب تک ان کو صحیح سمجھا جائے گا۔ ان تجربات کی رُو سے اٹھارہ سال کی عمر تک انسان کھانے کے اعتبار سے بچہ متصور ہوتا ہے چنانچہ انہوں نے غذا کا ایک فارمولا بنایا ہے اور وہ یہ ہے کہ اٹھارہ سال کی عمر تک کا بچہ (کھانے کے لحاظ سے وہ بچہ ہے) جس وقت جس چیز کی جتنی مقدار میں خواہش کرے وہ اسے ملنی چاہئے۔ تب اس کی (جسمانی) صحیح نشوونما ہوسکتی ہے اسی واسطے اٹھارہ سال کی عمر سے کم کے بچوں کو عادت ڈالنے کے لئے تو کچھ روزے رکھوانے چاہئیں لیکن ایک مہینہ کے لگاتار روزے نہیں رکھوانے چاہئیں کیونکہ رمضان کے لئے وہ عمر بلوغت نہیں ہے رمضان کا تعلق انسان کی روح سے بھی ہے مثلاً تنویرِ قلب ہوتی ہے۔ رُوح میں روشنی اور بشاشت پیدا ہوتی ہے۔ انسان پر اگر اللہ تعالیٰ کا فضل ہو جائے تو وہ روحانی طور پر ترقی کر کے کہیں سے کہیں جا پہنچتا ہے۔

غرض روزوں کا انسانی جسم پر بھی اثر ہے۔ اخلاق پر بھی اثر ہے۔ مختلف چیزوں پر اثر ہے لیکن جسم پر بھی اثر ہے مگر اٹھارہ سال کے بعد انسانی جسم پر روزے کا اچھا اثر پڑے گا یعنی صحت قائم رہے گی۔ اٹھارہ سال سے کم عمر والا بچہ خواہ اپنی عمر کے لحاظ سے بہترین صحت میں ہو۔ مثلاً دس سال کا بچہ ہے یا آٹھ سال کا بچہ ہے اور پورا صحت مند ہے۔ اس کی آنکھوں میں چمک ہے اور فراست ہے اور طاقت کے آثار ہیں لیکن خدا تعالیٰ اُسے فرماتا ہے کہ تو روزہ نہ رکھ کیونکہ تیری نشوونما کا زمانہ ہے۔ روزے کی بلوغت کے دائرہ میں تو داخل نہیں ہوا۔ جب داخل ہو جائے گا تو ٹھیک ہے پھر اللہ تعالیٰ اسی طرح صحت قائم رکھے تو وہ ساری عمر روزے رکھتا چلا جاتا ہے مگر کئی لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں پچاس سال کی عمر میں روزے کی طاقت نہیں رہتی۔ ڈاکٹر کہتا ہے روزے نہ رکھو کیونکہ کسی کے دل میں تکلیف ہو جاتی ہے، کسی کے جگر میں تکلیف ہو جاتی ہے کسی کی ہڈیوں میں تکلیف ہو جاتی ہے کسی کے سینے میں تکلیف ہو جاتی ہے، کسی کے اعصاب میں تکلیف ہو جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہزار ہا بیماریاں ہیں جو ہزاروں انسانی خطاؤں کے نتیجہ میں انسانی جسم میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن ایک ایسا بچہ بھی ہے جس کو اٹھارہ سال کی عمر تک پوری صحت کے باوجود سارے روزے رکھنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا وہ ستر سال کی عمر میں بھی آرام سے روزے رکھتا ہے اور اسے کچھ پتہ ہی نہیں لگتا۔

بہر حال اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا یَخَافُ رَھَقًا کہ اے انسان! خواہ تیری صحت کیسی ہو! خواہ تیری عمر کتنی ہو! خواہ تیرا ماحول کیا ہو! تیری طاقت کے خلاف یا تیری طاقت سے بڑھ کر بوجھ تمہارے اوپر نہیں ڈالا جائے گا۔

پھر مثلاً نماز ہے۔ بڑا زور دیا ہے کہ مسجد میں آ کر نماز پڑھو لیکن یہ نہیں کہا کہ ہر فرد کے لئے مسجد میں آ کر نماز پڑھنا ضروری ہے ورنہ وہ کافر ہو جائے گا۔ یہ اسلام میں نہیں ہے۔ اسلام نے کہا ہے کہ جو آدمی بیمار ہے وہ اپنے گھر پر نماز پڑھ لے۔ نماز کی ایک ظاہری شکل بنائی ہے مثلاً ہم کھڑے ہوتے ہیں پھر رکوع کرتے ہیں پھر کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر سجدہ میں جاتے ہیں۔ پھر دو سجدوں کے درمیان بیٹھتے ہیں۔ پھر ہم التحیات یعنی قعدہ میں بیٹھتے ہیں لیکن ایک بیمار شخص ان ساری اشکال کے مطابق یا بعض شکلوں کے مطابق نماز نہیں پڑھ سکتا۔ اس کو کہا کہ لَا تَخَفُ رَھَقًا کہ تجھ پر ایسا بوجھ نہیں ڈالا جائے گا جو تیری طاقت سے بالا ہو۔ چنانچہ بیمار، معذور یا مجبور ہونے کی صورت میں ایک کو کہا کہ تُو بیٹھ کر نماز پڑھ لے، دوسرے کو کہا کہ تو لیٹ کر نماز پڑھ لے، تیسرے کو کہا کہ تو اشاروں سے نماز پڑھ لے۔ چوتھے سے کہا کہ تو ہتھیار باندھ کر نماز پڑھ اور اپنا کام کرتا جا۔

غرض اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا اتنا خیال رکھا ہے کہ اگر سوچیں تو ہم خود اتنا خیال نہ رکھ سکتے۔ لَا یَخَافُ رَھَقًا کے اعلان کے بعد کسی کو یہ خوف نہیں ہوگا کہ وہ کسی وقت ایسی منزل میں ہوگا یا ایسی حالت میں ہوگا کہ اسلام کے کسی حکم کی پابندی نہ کر سکے تو گناہ گار بن جائے گا۔ اس شکل میں تو پابندی نہیں کرے گا لیکن گناہگار نہیں بنے گا۔ مثلاً جو آدمی بے ہوش ہے اور بعض دفعہ چار چار دن تک آدمی بے ہوش رہتا ہے کیا ایسا شخص نمازیں چھوڑ کر گناہگار بن گیا؟ نہیں لَا یَخَافُ رَھَقًا کی رو سے جو اس کی طاقت نہیں ہے اس سے زیادہ اس پر بوجھ نہیں ڈالا جائے گا بلکہ یہاں تک فرمایا کہ اگر اپنی غلطی کی وجہ سے بھی تم بیدار نہ رہو اور سُکران کی حالت میں ہو تب بھی نماز پڑھنے کے لئے انتظار کرو۔ وہ دوسرا جرم ہے لیکن نماز کو جان بوجھ کر چھوڑ دینا یہ بہت بڑا جرم ہے مگر اس کا بھی خیال رکھا۔ ماں نے کیا خیال رکھنا ہے اور باپ نے کیا توجہ دینی ہے اور دوست نے اخوّت کا کیا مظاہرہ کرنا ہے۔ تمہارے رب نے تو کہیں زیادہ ہم

سے پیار کیا اور پیار کی شکلیں بنا دیں پس بد بخت ہے وہ آدمی جو اپنے خدا کو چھوڑتا ہے اور ایمان بالرّب نہیں لاتا۔ پھر تو اس کو ”بخس“ کا بھی ڈر ہے اس پر ظلم بھی ہوں گے اور اسے نقصان بھی پہنچیں گے اور ان کا کوئی مداوا نہیں ہوگا۔ اپنے رب کو چھوڑ کر وہ کہاں جائے گا اور پھر یہ بھی ہوگا کہ گناہ کرے گا کیونکہ اپنی طرف سے جو شرعی حکم بنائے گا اور سمجھے گا کہ شریعت اسلامیہ حقہ نے جو احکام (اوامر ونواہی) دیئے، اس سے زیادہ مجھے چاہیئے وہ بھی گناہگار بن جاتا ہے۔ تکمیل شریعت میں اسی طرف اشارہ ہے۔

پس اپنے رب سے پختہ تعلق قائم کرو۔ رمضان کا ایک موقع تھا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا۔ جو سبق آپ کو اور مجھے سیکھنا چاہیئے تھا خدا کرے کہ وہ سبق ہم سیکھیں اور پھر بھولیں نہ۔ کیونکہ اپنے رب سے تو ہمیشہ کا ساتھ ہے۔ وہ کون سی گھڑیاں ہیں جو آپ اپنے رب سے چھپ کر گزار سکتے ہیں۔ جب اس سے ہمیشہ کا ساتھ، ہمیشہ کا واسطہ ہے اور ہمیشہ کے پیار کی ضرورت ہے اور اس نے اپنے آپ کو بار بار رحم کرنے والا کہا ہے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ تمہیں میرے رحم کی بار بار ضرورت پڑے گی۔ یہ نہ سمجھنا کہ ایک کروڑ دفعہ میں نے تم پر رحم کیا ایک دفعہ اَور رحم نہیں کر سکتا یا ایک ارب دفعہ رحم کیا ہے تو اَور دس ارب دفعہ نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں بار بار رحم کرنے والا ہوں۔ یہ میری صفات میں سے ہے۔

پس اپنے اس پیارے رب سے اپنا تعلق پیدا کرو اور اپنی ذمہ داریوں کو نبھاؤ اور اپنی دعاؤں میں تحریک جدید کے اُن مخلصین کو بھی یاد رکھو جو اخلاص کے ساتھ خدا تعالیٰ کی راہ میں پیسے خرچ کرتے ہیں۔ تحریک جدید کی طرف سے کل رپورٹ آئی تھی مجھے تو آج ہی ملی ہے سال رواں میں نو سو پندرہ مخلصین نے اپنے وعدے کی پوری رقوم ادا کر دی ہیں گو میں نے ایک سر سری نظر ڈالی تھی پھر بھی مجھے تعجب ہوا کہ بعض دوستوں نے اپنی حیثیت سے بہت کم چندہ لکھوایا ہوا ہے لیکن بہر حال اللہ تعالیٰ ان کو اجر عطا فرمائے۔ ان میں سے اکاون مخلصین نے ایک ایک ہزار روپے کا وعدہ کیا تھا اور وہ پورے کا پورا ادا کر دیا ہے۔ ان کو بھی دعاؤں میں یاد رکھیں اور جنہوں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا ان کو بھی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو بھی توفیق عطا فرمائے مالی لحاظ سے بھی اور اخلاص کے لحاظ سے بھی کہ وہ بھی جلدی اپنے اپنے وعدوں کو پورا

کریں۔

دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے رب سے تعلق کی پختگی صرف نوجوانی کی عمر سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ انصاراللہ کی عمر سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ شاید کوئی شرمائے کہ وہ دھیلے سے آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ انصاراللہ کا چندہ ایک دھیلہ فی روپیہ ہے۔ اُس وقت بھی دھیلہ تھا جب روپے کے چونسٹھ پیسے تھے اور اس وقت بھی دھیلہ ہے جبکہ روپے کے یک صد پیسے ہو گئے ہیں۔ بہر حال خلیفۂ وقت کا کام سہارا دینا بھی ہے اس لئے میں نے سہارا دے دیا اور انصاراللہ کے چندے کی جو شرح ہے وہ میں نے دھیلے سے بڑھا کر پیسہ کر دی ہے اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ سب کو بھی جن کی عمر زیادہ ہے اس کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

اس عمر میں تو ہمیں زیادہ فکر ہونی چاہئے۔ یا تو یہ ہو کہ انصاراللہ کے جو کام ہیں اُن کی ضرورت نہیں رہی۔ خدام جن کے پاس کبھی پیسہ اکٹھا ہی نہیں ہوتا تھا اور انصار سے مانگ مانگ کر ہم اپنی ضرورتیں پورا کیا کرتے تھے مگر اب یہ ہے کہ اُن کا چندہ انصار سے کئی گنا زیادہ ہو گیا ہے اس کی ایک وجہ تو میں نے پہلے بتائی تھی کہ پچھلی پود کثرت سے جوانی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے اگر جماعت کی تعداد وہی رہتی تو پھر تو یہ شکل نہ بنتی لیکن آج سے تیس سال پہلے جو نسبت انصار اور خدّام کی تعداد میں تھی آج وہ نسبت نہیں ہے۔ صحیح طور پر تو مجھے علم نہیں اور نہ کبھی اس قِسم کی مردم شماری ہوئی ہے لیکن اگر فرض کر لو تیس سال پہلے پچاس فی صد احمدی نوجوان یعنی پندرہ سال سے اوپر کی عمر کے خدام میں شامل تھے تو پچاس فیصد انصار میں شامل تھے مگر آج تیس سال کے بعد یہ شکل نہیں رہی۔ آج یہ شکل ہے کہ تیس فیصد انصار میں شامل ہیں اور ستر فیصد خدام میں شامل ہیں کیونکہ پیچھے سے اللہ تعالیٰ کے فضل کا ایک بڑا ریلا آ رہا ہے۔ ہم ہر لحاظ سے بڑھ رہے ہیں۔ نئے نوجوان احمدی ہو رہے ہیں اور ہماری احمدی بہنیں بہت بچے پیدا کر رہی ہیں۔ وہ بیچاری تکلیف اُٹھا کر یہ قربانی دے رہی ہیں خدا کرے وہ بھی اَور زیادہ قربانی دیں۔ اب بھی بہت سی بہنیں قربانی دے رہی ہیں۔ یعنی اپنے بچے احمدیت کے نام پر خدا کے لئے وقف کرنے کی شکل میں وہ پیدا کر رہی ہیں یعنی وقف کے لئے یہی ضروری نہیں ہے کہ تحریک جدید کا واقف ہو۔ نیت وقف کی ہونی چاہئے ان کی تربیت

کا بھی خاص خیال رکھیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی بھی توفیق بخشے۔ (آمین)

بہرحال انصار اور خدام کی تعداد میں بڑا فرق پڑ گیا اور پھر اس وجہ سے چندوں میں بھی فرق پڑ گیا پھر خدام الاحمدیہ، جن کی عمر سولہ سے چالیس تک ہے ان کی مجموعی آمدنی جتنی تیس سال پہلے تھی اِس وقت یقیناً اس سے سو گنا زیادہ ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ بڑے فضل کر رہا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ انصار اللہ والے کیوں مایوس ہو جائیں کہ اُن پر اللہ تعالیٰ فضل نہیں کرے گا پس وہ دھیلے سے پیسہ شرح چندہ مقرر کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کے مال میں بھی برکت دے گا بہرحال یہ ذیلی چیزیں ہیں جن کی طرف میں نے توجہ دلا دی ہے۔

میں نے بتایا ہے کہ اس چھوٹی سی آیت میں بڑا ہی لطیف مضمون بیان کیا گیا ہے۔ جو شخص بھی اپنے رب سے سچا اور پختہ تعلق پیدا کر لیتا ہے، اس کو نہ ظلم اور نقصان کا کوئی خطرہ باقی رہتا ہے اور نہ اس کو یہ خطرہ رہتا ہے کہ شریعت کے نقص کی وجہ سے وہ گناہگار ہو جائے گا یا بدلے ہوئے حالات میں شریعت اگر اس کے مسائل حل نہ کرے تو اس لحاظ سے بھی یہ نہیں کہ وہ گناہگار ہو جائے گا پھر نہ اس کو یہ خطرہ رہتا ہے کہ عقل پر ہی بھروسہ کرنا ہے۔ عقل کبھی صحیح راستہ پر چلتی اور کبھی بھٹک جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تمہاری عقلوں کو شریعت محمدیہ پر عمل پیرا ہونے کے نتیجہ میں روشنی عطا کروں گا اور ان عقلوں میں ایک جلا پیدا کروں گا پھر تم دُنیا کے معلّم بن جاؤ گے بشرطیکہ اللہ تعالیٰ سے پختہ تعلق پیدا کر لو اور پھر قرآن کریم جو علموں کا خزانہ اور معرفت کا ایک سمندر ہے وہ تمہیں دیا گیا ہے اس لئے کم علمی اور سفاہت اور حُمق کا تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن اس سمندر میں غوطہ لگانا ضروری ہے پھر یہ بھی ہے کہ بدلے ہوئے زمانوں میں، بدلے ہوئے حالات میں (وقتی طور پر اجتماعی یا انفرادی حالات بدلتے ہیں یا بیماریوں اور بڑھاپے کی وجہ سے مستقل طور پر حالات بدل جاتے ہیں مثلاً چندے کے لحاظ سے بعض تاجر ایسے بھی ہیں جو دس دس، بیس بیس ہزار روپے چندہ ایک وقت میں دے دیتے ہیں پھر ان کے حالات بدل جاتے ہیں۔ انہیں نقصان ہو جاتا ہے تو بیس روپے تک دینے کے قابل نہیں رہتے) خدا تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ جب تمہیں بیس ہزار روپے دینے کی طاقت تھی تم نے دیا اور

میں نے قبول کر لیا اور میں تمہیں اس کی جزا دوں گا لیکن جب تمہیں بیس روپے دینے کی طاقت ہوگی تو میں قبول نہیں کروں گا۔ خدا تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا بلکہ اُس نے یہ فرمایا ہے جتنی تمہاری طاقت ہے اتنا چندہ تم دے دو پھر جتنی میری رحمت ہے اس سے تم حصہ لیتے چلے جاؤ گے پس بندے کی اس قربانی اور خدا کی اس رحمت کا آپس میں کیا مقابلہ ہے۔

خدا کرے کہ وہ ہمیشہ ہمیں بے حساب اجر عطا فرمائے۔ اس کی رحمت کے دروازے رمضان میں خصوصیت سے کھلتے ہیں۔ خدا کرے کہ ہمارے لئے ہمیشہ ہی اس کی رحمتوں کے دروازے کھلے رہیں۔

خطبہ ثانیہ سے پہلے حضور نے فرمایا:-

نماز عصر سے قبل درس دینے والے دوست مولوی ظہور حسین صاحب سوائے آخری ایک سورۃ کے باقی کا درس مکمل کر دیں۔ عصر کی نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی توفیق سے میں انشاء اللہ آخری سورۃ کی تفسیر کے ایک چھوٹے سے حصہ کو بیان کر کے دعا کرا دوں گا۔

(روزنامہ الفضل ربوہ ۱۶ جنوری ۱۹۷۲ء صفحہ ۱ تا ۶)

* * *